ڈاکٹر فرحت جبیں ورک
استاد شعبہ اردو، پنجاب کالج آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، راولپنڈی

منیر نیازی کی شاعری میں ڈر، خوف اور تنہائی کا نفسیاتی پس منظر

Dr. Farhat Jabeen Virk

Department of Urdu,Punjab College for Women,Rawalpindi.

The Psychological Background and Analysis of Fear, Fright, and Solitude in Munir Niazi's Poetry

After the independence of Pakistan writers and poets have been dilating upon the social degeneration in the society, economical dilapidation and the resultant puzzled psychology of human beings. Munir Niazi has unique distinction that he depicts the Intimidation, Fear, Fright, Fatigue and Solitude that grab the human physiology in its claws, in such a way that these elements appear in his own psychological puzzledom rather than anybody else's. Additionally one thing that completely captivates the heart and mind of the reader is that Muni Niazi does not return like a fearful child. Rather his action of staying and thinking entices the reader to continue the journey. His mission to search a large number of care givers to treat the puzzled psychology in the society is an outstanding attribute of Munir Niazi. In this article we find, in his poetry, the effects of the background of the Intimidation, Fear, Fright, Fatigue and Solitude in the shape of lack of adjustability after migration.

۱۹۴۷ء کے اثرات اُردو شاعری میں بڑے دیرپا ثابت ہوئے قیام پاکستان کے بعد فسادات، قتل و غارت، لُٹے ہوئے گھر اور بے سروسامانی کے عالم میں قافلوں کی بے بسی کے مناظر نے غزل اور نظم دونوں کی امیجری کو بدل دیا۔ اُردو

شاعری نے معاشرے میں جنم لینے والے ڈر، خوف، دہشت، خطرے اور تشکیک کے رویوں کو اپنے دامن میں سمویا اس کے ساتھ ساتھ ہجرت کرنے والے ہر اُس شخص کی نفسیاتی الجھنوں اور بے بسی کی تصویر کشی کی، جو نئے معاشرے میں اپنے آپ کو اجنبی سمجھنے لگا۔ ایک ایسا انسان جو پیار محبت اور خلوص کے درمیان پروان چڑھا اور جس نے نہ صرف الگ وطن پاک سرزمین کے لیے نعرے لگائے بلکہ ہجرت کے دوران اپنے پیاروں کے خون کا نذرانہ پیش کر کے حب الوطنی کا ثبوت بھی دیا۔ وہ سپنوں کے دیس میں قدم رکھتے ہی تنہائی کا شکار ہو گیا۔ یہاں آ کر حالات کے تھپیڑوں نے اُس کی سفر کی تھکن کو تازہ کر دیا۔ اپنے ہی لوگوں کی بے رُخی، سیاسی قائدین کا وعدوں سے انحراف، مخلص قیادت کا فقدان، بے ایمانی، جھوٹ، مکر و فریب کے نت نئے جال، یہ سب ایسے ہتھکنڈے تھے کہ جس نے انسان کو اُس کی بے وقعتی کا احساس دلانے میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔

اس عمل سے انسانی اقدار کو جس طرح سے مسخ کر کے خون کی ہولی کھیلی گئی، اُس نے شعراء و ادباء کو متاثر کیا۔ ہر شاعر نے اُس دور اور اُس کے بعد کے حالات کی عکاسی کسی نہ کسی صورت میں اپنے اپنے احساس، شاعرانہ تخیل کے تحت کی۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مطابق: ''خیال بجائے خود شاعرانہ نہیں ہوتا بلکہ شاعر کا خصوصی ادراک، اس کے جذب کی شدت اور فنکار کی قوتِ متخیلہ، خیال میں شعریت پیدا کرتے ہیں۔ شاعر کے خارجی ماحول میں جو صورتِ حالات اور اس کے باطن میں جو تموج محسوس ہوتا ہے، وہ انوکھے تال میل کے ساتھ شاعرانہ خیال کا باعث بنتا ہے''۔[۱] اپنے دور کے سیاسی سماجی، معاشی حالات کی وجہ شکست و ریخت کے شکار معاشرے کی کہانی، دُکھ درد کو ہر شاعر نے اپنے اپنے طور پر بیان کیا۔ اُن شعراء میں منیر نیازی ایک ایسے شاعر تھے کہ جنھوں نے ایک عہد کی فنا پذیری، ناتوانی، شکست خوردگی کو جس طرح تخلیقی سطح پر بیان کیا، وہ صرف انھی کی شاعری کا حصہ ہے۔ اُن کے ہاں معاشرے میں موجود مختلف سطح کے مسائل جوں کے توں بیان نہیں کئے گئے بلکہ ایک ایسا رویہ اور فکر ملتی ہے کہ جس میں اُن مسائل کے نتیجے میں معاشرے میں موجود ہر فرد کی زندگی کی مجموعی فضا کا ذکر ہے۔ یوں منیر نیازی بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ معاشرے کی اس شکست و ریخت کے نوحہ خوانوں میں شمار ہوتے رہے۔ خود منیر نیازی کے ہاں احساسِ تنہائی اور مختلف انجانے ڈر، خوف کے احساسات خود کو معاشرے سے ہم آہنگ نہ کر پانے کے احساس سے وجود میں آئے۔ ڈر، خوف، دہشت، تھکن اور تنہائی ایسے احساسات ہیں جو معاشرے میں ہونے والے ظلم و زیادتی اور انسانی رویوں سے ایک باشعور اور حساس انسان کے دل و دماغ پہ چھائے رہتے ہیں۔

منیر نیازی ایک طرف تو ماضی کی قدروں سے جذباتی وابستگی رکھتے ہوئے ان کا تحفظ چاہتے رہے لیکن دوسری جانب جب انھیں حال اور ماضی کے بُعد کو دیکھتے ہوئے لامتناہی فاصلہ نظر آیا تو یہ فاصلے کا دُکھ، سفر کی رائیگانی کے احساس کی صورت میں اُن کا موضوع بن گیا۔ منیر نیازی کی تصویروں کا شخص ایسے دوراہے پر کھڑا نظر آتا ہے جو کبھی ماضی کی طرف لپکتا ہے اور کبھی حال کی سمت بڑھتا ہے چنانچہ یہ کشمکش، فیصلہ نہ کر پانے کا عذاب اُسے عدم تحفظ کا شکار کر دیتا ہے اور ایک حساس انسان اکثر ناسٹلجیا کے شکنجے میں بھی آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، اس ضمن میں کہتے ہیں:

غریب الوطنی کے عوامل سے حافظے میں محفوظ ماضی اور اس کی بازگشت کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ کہنے کو تو ناسٹلجیا

انسان کو مستقبل کی بجائے ماضی میں اُٹھا کر رکھ دیتا ہے مگر اسے کیا کیجئے کہ مستقبل کی راہیں بھی ماضی کی روشنی کے سہارے ہی استوار کی جاتی رہی ہیں اور جہاں تک ماضی کی یاد یا ناسٹلجیا کے تخلیقی قوت محرکہ ہونے کا سوال ہے تو دُنیا کے بعض نمائندہ ترین کلاسیکی اور جدید ادب پارے انہیں یادوں اور ان کی بازگشت کے رہینِ منت ہیں۔ (۲)

منیر نیازی مختلف چیزوں، انسانی گھناؤنے کرداروں، زندگی میں انسانوں ہی کی طرف سے انسانی معاشرے کے لیے پیدا کئے گئے پیچیدہ مسائل سے اداس ہوتے ہیں اور یہی اُداسی، مایوسی اور پھر نا اُمیدی سے ڈر اور خوف جیسے عناصر کو بھی جنم دینے کا باعث بنتی ہے۔ منیر نیازی نے اپنے فن کے لیے امکانات کی حد تک پھیلا وسیع کینوس چُنا اور ایسا کینوس ڈر اور خوف، دہشت اور مختلف اندیشوں میں گھرا انساں نہیں چُن سکتا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے وسیع کینوس اور کائنات میں غور وفکر کا کام کرنے والا احساس فرد جب انسانیت کے دُکھ درد کے مداوے کے لئے معالجوں کی بڑی تعداد کا کھوجی ہو تو خود کو اس مشن پر تنہا پا کر ایک بار ڈرتا اور جھجکتا ضرور ہے۔ سو یہی صورتحال منیر نیازی کے ہاں بھی نظر آتی ہے مگر وہ خوفزدہ ہو کر پلٹتے نہیں بلکہ رُک کر مزید غور وفکر کرتے ہیں اور آگے کی طرف سفر جاری رکھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر شہپر رسول:

ان کی تخلیقی فکر میں خوف، آسیب، ڈر اور تنہائی جیسے الفاظ اساسی حیثیت رکھتے ہیں اور عالم فانی، موت، ہوا، پانی، شراب، دہشت، اُداسی، حیرت، خاک وخون، ماہ جنون خیز، دستکِ غم خوار یار، حادثاتِ دہر اور گناہِ دائمی وغیرہ الفاظ وتراکیب بنیادی الفاظ کے تلازمات کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ (۳)

منیر نیازی کے ہاں ہمیں ڈر، خوف، دہشت، تھکن، تنہائی جیسے اثرات کے پس منظر میں ہجرت کا تجربہ کارفرما نظر آتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

(دشمنوں کے درمیان شام، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص۔ ۳۱۲)

یہاں رائیگانی کا خوف، ہجرت کے سفر سے شروع ہو کر بالآخر پاکستانی معاشرے میں پہنچ کر انسانی زندگی کا ایک بنیادی اور دائمی المیہ بن جاتا ہے۔ دوران ہجرت غیروں کی سازشیں اور حملے اور بعد از ہجرت اپنوں کی بیگانگی، دھوکے، فریب اور سازشیں ایسے چرکے تھے کہ جس نے ہر مہاجر کو ضرورت سے زیادہ حساس بنا دیا۔ پاکستان بننے کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ لُٹے پٹے قافلوں کے زخموں پر پیار ومحبت اور اخوت سے بھرپور پھاہے رکھے جاتے نہ کہ نئے کرب واذیت میں مبتلا کیا جاتا۔ مگر قیامِ پاکستان کے پہلے دن سے ہی مہاجرین کی خوراک، آبادکاری، نوکریوں کے مسائل، جائیدادوں کی تقسیم کے ناگوں نے ایسے پھَن پھیلائے کہ انھیں نئے معاشرے میں قبولیت ملتی نظر نہ آئی۔ وعدے جو اُن سے کئے گئے تھے وہ پورے نہ ہو سکے۔ اُلٹا پاکستان کی اپنی بقا، قائداعظم کی وفات کے ساتھ ہی خطرے میں پڑ گئی اور پھر پاکستانی معاشرے کے حالات روز بہ

روز بگڑتے ہی چلے گئے۔ مارشل لاز کے پے در پے وار، ۱۹۶۵ء کی جنگ اور ۱۹۷۱ء کے سقوطِ ڈھاکہ نے رہی سہی اُمیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ یہی نہیں اور بھی بہت سے مسائل تھے جنہوں نے معاشرے کے ہر حساس فرد کے نفسیاتی کرب میں اضافہ کیا۔ بے روزگاری اپنوں کی طوطا چشمی، کلاشنکوف کلچر کی آمد، اچھے بَر نہ ملنے کا المیہ، جہیز کی لعنت، روز بروز تباہ ہوتی معیشت، سیاستدانوں کے دھوکے، یہ سب انسانی زندگی کے وہ المیے تھے جنہوں نے کچھ کو مالی طور پر تباہ حال کیا تو کچھ کو نفسیاتی طور پر مریض بنا کر ہی دم لیا۔ اُس پر طرّہ یہ کہ ان برائیوں میں کمی کی بجائے روز بروز اضافہ ہی ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں مختلف شعراء کے ہاں شہر اجڑے اور لوگ روحانی طور پر بیمار نظر آتے ہیں۔ منیر نیازی کے ہاں اس تمام صورتحال کی وجہ سے ہمیں شام، جنگل، ہوا، پانی، چاند، دشت و جبل، یہاں تک کہ فضا کے ہر رنگ پر ڈر، خوف، دہشت کے باعث تھکن اور تنہائی کی لپیٹیں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے مطابق:

> منیر نیازی کی ابتدائی غزلیں عہد جدید میں موجود دہشت، خوف اور بربریت کے احساسات کا بھرپور اظہار کرتی ہیں۔ تشدد، دہشت، قتل و غارت گری، اجاڑ پن کے تصورات و تلازمات سے ان کی ابتدائی غزلیہ شاعری بھری پڑی ہے۔ (۴)

مگر جب ہم منیر نیازی کی مکمل شاعرانہ فضا کا ایک بھرپور جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ڈر، خوف، دہشت کے یہ احساسات صرف اُن کی ابتدائی غزلوں پر ہی طاری نہ تھے بلکہ تشدد، وحشت، بربریت، جبر، پسماندگی کے احساسات پر مشتمل اُن کی شاعری میں ظلم، تنہائی اور سماجی گھٹن کے اشارے آخر تک نظر آتے ہیں۔ دیکھا جائے تو جدید شاعر بھی وہی ہے جو ان معاشرتی رویوں اور انسانی جذبات و احساسات کی بھرپور عکاسی کرے۔ جدید شعراء کے ان رجحانات کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں:

> داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعر کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف، تنہائی، کیفیت انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج پر اظہار کرتی ہے جو جدید صنعتی دور، مشینی میکانکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوشحالی کا عطیہ ہے۔ جدید ادب گرتی ہوئی چھتوں، لڑکھڑاتے سہاروں اور کل تعداد بھول بھلیوں کے خوفناک احساس گم کردگی سے عبارت ہے۔ (۵)

منیر نیازی کی غزل اور نظم دونوں میں ہی ڈر، خوف اور زیاں کا احساس شاعری کا محرک بنا ہے اور اس سے جو منظر نامہ تشکیل پاتا ہے وہ انسانی زندگی میں تھکن، دہشت اور تنہائی کے احساسات کو خوبصورتی سے اجاگر کرتا ہے۔ اسی منظر نامے کو علامت بنا کر وہ دراصل ہمارے سامنے عصری حالات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سہیل احمد خاں: ''الف لیلوی اور طلسماتی ماحول برصغیر کی تقسیم کے بعد کی شاعری میں اچانک اُبھرا تھا۔ مگر کچھ شاعر اس ماحول کی تصوراتی فضاؤں ہی میں رہ گئے جب کہ منیر کے ہاں آ کے چل کر اس فضا کی تمثالوں کو عصری زندگی پر منطبق کرنے کا رجحان اُبھرا۔ جس نے اس کی شاعری کی معنویت کو اور گہرا کر دیا''۔ (۶) منیر نیازی کی شاعری پر وجودی عناصر کی چھاپ بھی دیکھی جا سکتی ہے کیونکہ انھی عناصر کے سبب

ڈر،خوف اور اکتاہٹ جنم لیتی ہے۔اس کی کچھ مثالیں ملاحظہ کیجئے:

خوف سے گھبرا کے میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی
اُف خدا ! یہ سانس جیسے اک قیامت بن گئی

(جنگل میں دھنک،مشمولہ کلیاتِ منیر،ص-۲۱۲)

ڈرے ہوؤں کو مگر اعتبار کس کا تھا
تمام عمر ہمیں انتظار کس کا تھا

(ماہِ منیر،مشمولہ کلیاتِ منیر،ص-۴۴۴)

خوف آسماں کے ساتھ تھا سر پر جھکا ہوا
کوئی ہے بھی یا نہیں ہے، یہی دل میں ڈر رہا

(جنگل میں دھنک،مشمولہ کلیاتِ منیر،ص-۲۵۲)

اس سلسلے میں نظر صدیقی کی رائے بڑی اہمیت کی حامل نظر آتی ہے:''انسانی زندگی کی لایعنیت (Absurdity) اور اکتاہٹ (Boredom) عہد حاضر کے وجودی (Existenitial) احساسات میں سے ہے''(۷)

منیر نیازی کے اکثر شعروں میں ان احساسات کی عکاسی ہوتی ہے۔زندگی کے بے معنی ہونے کا احساس اور اکتاہٹ پیدا کرنے والے انسانی رویوں سے دلبرداشتہ ہوکر ہی تو شاعر یہ کہنے پر مجبور ہے:

معنی نہیں منیر کسی کام میں یہاں
طاعت کریں تو کیا ہے بغاوت کریں تو کیا

(چھ رنگین دروازے،مشمولہ کلیاتِ منیر،ص-۵۲۵)

منیر نیازی اپنی اس اکتاہٹ کا ذمہ دار سماج کے نام نہاد ٹھیکیداروں کو نہیں ٹھہراتے بلکہ اس کیلئے وہ اپنی بیزار رہنے والی طبیعت کو ہی موردِ الزام ٹھہراتے ہیں:

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

(ایضاً،ص-۴۹۹)

منیر نیازی ڈر،خوف اور تنہائی کو بیان کرنے کے لئے کبھی شام کی خاموشی اور ہوا کی سرسراہٹ کا سہارا لیتے ہیں تو کبھی دشت وجبل میں پھیلے سناٹے کا ذکر کرتے ہیں۔اس ڈر اور خوف کا تعلق اگر دیکھا جائے تو شاعر کے گردوپیش کے ماحول کی گھٹن سے ہے اور دوسری طرف خود شاعر کی ذات سے بھی شاعر جو بظاہر انجمن آراء،لطیفہ باز، ہر وقت بے قرار اور آس پاس کو بُھلانے کا رسیا تھا،اس کے دل میں جو گرہ پڑ گئی،اُسے وہ اپنی شاعری ہی کے ذریعے کھولتا رہا یا پھر وہ یادوں میں گُم، ماضی

میں کھویا ہوا، اپنے سابقہ تجربات کو بار بار یاد کرنے والے عناصر دُکھ، درد، ڈر خوف، نا اُمیدی و نارسائی سے پیدا ہونے والی تھکن اور تنہائی کا نوحہ خواں رہا۔ اس کے اندر کے طوفان نے گردوپیش کے طوفان کے درمیان ایک پُل کا کام دیا۔ زمانے کے تضادات اور اپنے داخلی تضادات میں منیر نیازی کو گہری مماثلت نظر آئی۔ یہ سماج بھی ایک جنگل ہے اور کبھی یہ پورا جنگل انسان کی روح میں گھر کر لے تو پھر یہ اُس کے ساتھ رہنے والوں کو بھی دکھائی دیتا ہے۔ منیر نیازی کے ہاں ہمیں جنگل کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اس ضمن میں انتظار حسین کہتے ہیں: ''منیر نیازی وہ شخص ہے جس کے اندر کا جنگل جاگ اُٹھا ہے اور سنسنا رہا ہے۔ اس نے مڑ کر جو دیکھ لیا ہے۔ اس کی شاعری کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہم جنگل میں چل رہے ہیں اور پاتال میں اتر رہے ہیں، عجیب عجیب تصویریں ابھرتی ہیں''۔ (۸) جنگل کی علامت سے ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ منیر نیازی کے وجود میں احساسِ شکست، ڈر اور خوف کی جو کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ بیرونی دنیا کی ناہمواریاں شاعر کو دروں بین بنا دیتی ہیں اور خارجی دنیا اُس کے لیے بے معنی ہوگئی ہے اب اُسے صرف اپنی ذات کی فکر ہے لیکن ایسا نہیں بلکہ شاعر قنوطیت کا شکار ہونے کی بجائے ایسے افراد کے گروہ کی تلاش میں ہے جو تمام انسانوں کو آلام کے جنگل سے نجات دلا سکے۔

منیر نیازی کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ باطنی و خارجی اعتبار سے وہ جن حالات و واقعات سے گزرے، اُن کی بنا پر منیر نیازی کے ہاں احتجاجی رویئے کے ساتھ ساتھ ڈر، خوف اور کرب کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

شہر کی گلیوں میں گہری تیرگی گریاں رہی
رات بادل اس طرح آئے کہ میں تو ڈر گیا

(تیز ہوا اور تنہا پھول، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۹۹)

کچھ عیشِ رائیگاں کی بھی جادوگری ہوئی
کچھ یادِ رفتگاں سے طبیعت ڈری ہوئی
بیٹھے ہوئے ہیں شہر نگاراں کے رُوبرو
چلتی ہے بادِ شام غموں سے بھری ہوئی

(تیز ہوا اور تنہا پھول، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۱۳۴)

نئے ماحول میں ڈر، خوف اور دہشت کے عناصر خود انسان کے پیدا کردہ ہیں۔ شاعر کے ہاں یہ ڈر، خوف، دہشت کے عناصر ۱۹۴۷ء کے بعد مسلسل انتشار کا شکار معاشرے کو دیکھ کر پیدا ہوئے ہیں۔ ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگیں اور اس دوران روز اپنے پیاروں کے بدلتے رویے، ان سب نے شاعر کے دل سے موت کے خوفناک منظر کو نکال باہر کیا اور ہمیں منیر نیازی کے ہاں موت کا منظر بھی جمالیاتی رنگ لئے نظر آتا ہے۔ امجد طفیل اس ضمن میں کہتے ہیں:

منیر نیازی کی شعری کائنات میں ڈر، خوف، دہشت، ویرانی، فاحشی اور تنہائی کے استعارے بار بار اپنا ظہور

کرتے ہیں، ان استعاروں کی تشریح وتعبیر دو سطحوں پر ممکن ہے۔ انفرادی سطح پر ہم انھیں فرد کے بنیادی وجودی معاملات سے جوڑ کر دیکھ سکتے ہیں۔ منیر نیازی کا یہ شعری تجربہ بیسویں صدی کے انسان کا تجربہ ہے۔ خاص طور پر دوسری جنگِ عظیم کے بعد کی دُنیا جو انسانی ہاتھوں کی لائی ہوئی تباہ کاریوں کی ہولناک تصویریں پیش کر رہی ہے اور اس کے سامنے ہمیں انسان بے بس و لاچار دکھائی دیتا ہے۔ شاعر اس ساری صورتِ حال میں ''موت'' کے مظہر کو جمالیاتی نشاط کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ''موت'' ایک المناک سچائی ہے جو انسانی زندگی میں اپنی عالمگیر اہمیت کے باعث ہمیشہ تخلیق کاروں کی توجہ اپنی جانب کھینچتی رہی ہے۔ کم وبیش ہر اہم شاعر نے موت کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے، لیکن بہت کم شاعروں نے موت کو جمالیاتی نشاط کے ساتھ محسوس کیا اور محسوس کروایا ہے۔ منیر نیازی ایک ایسا ہی شاعر ہے جس نے موت کو ایک المناک لیکن جمالیاتی نشاط انگیزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ (۹)

''موت'' جیسے ہولناک تصور میں بھی شاعر کی جمالیاتی حس کا جاگنا ہی تو اصل میں اُسے ایک اُونچے درجے کا جمال دوست شاعر بناتا ہے کہ وہ زندگی کی تلخ سے تلخ حقیقت میں بھی جمالیاتی پہلو ڈھونڈ لاتا ہے جس سے انسان میں ہر طرح کے حالات کا مقابلہ جرات سے کرنے کا حوصلہ ملتا ہے جیسے وہ کہتے ہیں:

زردی تھی رُخ پہ ایسی کہ میں ڈر گیا منیر
کیا عطر تھا کہ صرف قبائے خزاں ہوا

(جنگل میں دھنک، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص- ۲۴۲)

کبھی کبھی تو یوں بھی نظر آتا ہے کہ منیر نیازی کو معاشرے میں موجود ہر چیز بے معنی نظر آ رہی ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا وہ اس جہاں کو دیکھنا چاہتے تھے اب وہ ویسا بنتا نظر نہیں آتا۔ اُلٹا اُس میں دہشت وخوف، لاقانونیت، انسانی قدروں کی تذلیل اور بے راہ روی روز بروز زور پکڑتی نظر آتی ہے۔ کچھ اچھائیاں جو اس معاشرے کا کبھی حصہ تھیں وہ بھی مفقود ہوتی جا رہی ہیں۔ ایسے عالم میں شاعر کو تمام معاشرتی فضا ڈر، خوف، دہشت کے باعث سکوت کے عالم میں نظر آتی ہے۔ ایسے حالات میں ہر حساس انسان اپنے اندرون کی طرف ہجرت کی خواہش ظاہر کرنا شروع کر دے تو یہ ایک فطری عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منیر نیازی کو بھی بے جہت معاشرے اور اس میں ہونے والی سیاسی ومعاشی اکھاڑ پچھاڑ نے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں کی طرف کھینچا۔

گلشن کی خموشی تو اب جی کو ڈراتی ہے
کوئی بھی ہوا جس سے پتہ ہی کھڑک جائے

(تیز ہوا اور تنہا پھول، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص- ۸۴)

تم بھی منیر اب ان گلیوں سے اپنے آپ کو دور ہی رکھنا
اچھا ہے جھوٹے لوگوں سے اپنا آپ بچاتے رہنا

(جنگل میں دھنک، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۲۲۸)

اس صدا کی جہت نہیں کوئی
شورشِ دہر ہے نظام طلب

(آغازِ زمستاں میں دوبارہ، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۵۷۷)

منیر نیازی کی شاعری میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ انہوں نے ڈر، خوف کو مخصوص پیکر کی شکل دے کر مجرد (Abstract) سے مجسم (Concret) کر دیا ہے۔ ڈر اور خوف ایسی صورتحال ہے جس سے وہ موت کا سامنا بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسے بے خوف ہو کر پھر محسوس بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شہپر رسول کہتے ہیں:

> منیر نیازی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے غالب جذبے یعنی خوف کو بھی مخصوص پیکر کی شکل عطا کر دی ہے جس نے ان کے تمام پیکروں میں کلیدی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اگرچہ اس پیکر کے اجزائے تشکیلی میں قوت بصارت، قوت سماعت، قوت یادداشت اور قوت احساس کی سحر کاری نمایاں ہے لیکن خوف کا عنصر ان تمام مضمرات پر غالب نظر آتا ہے۔ (۱۰)

منیر نیازی کی شاعری میں ''ہوا'' کی علامت خوف، ڈر، دہشت کے ساتھ ساتھ موت کا پیغام بھی لاتی ہے۔ جب شہری زندگی کے مسائل بڑھنے لگتے ہیں اور انسان، انسانوں کی عام حق تلفی کرتا نظر آتا ہے تو پھر مظاہر فطرت بھی انسانی معاشرے کے خلاف ردِعمل کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے بارش نہ برسنا، زلزلے یا طوفان آنا، قحط پڑنا، سُبک رفتار ہواؤں کا سُرخ آندھیوں میں بدل جانا وغیرہ۔ ایسی صورت میں منیر نیازی ''ہوا'' کا بدلا رُوپ پیش کرتے ہیں کہ وہ کریہہ صورت میں پھر شہر میں وارد ہوتی ہے اور شہر کی گلیوں میں ایک عجب سناٹا طاری کر دیتی ہے اور بعض اوقات تو شہر کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتی ہے۔ تب منیر نیازی اِسے ایک بَلا کے رُوپ میں پیش کرتے ہیں جس نے شہر میں اپنے وجود کی آزادی کی خاطر ہر چیز کو برباد کر دیا۔ اِس حوالے سے وہ کہتے ہیں:

سفر میں ہے جو ازل سے یہ وہ بلا ہی نہ ہو
کواڑ کھول کے دیکھو کہیں ہوا ہی نہ ہو

(ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۴۱۶)

ہمیشہ سے جو چیز سفر میں نظر آتی ہے اور جو انسانی زندگی کا مقدر بھی ہے، وہ ''موت'' کے علاوہ اور کیا شے ہو سکتی ہے؟ مگر شاعر نے اسے ''ہوا'' کی صورت میں وارد ہوتے تو دکھایا ہے یعنی ''موت'' ایک ایسی حقیقت ہے جسے شاعر بھی سمجھتا ہے کہ یہ ہوا کی طرح جہاں چاہے گردش کرتی چلی جائے گی اور جانے کون سا دَر کھٹکھٹا ڈالے یعنی ''ہوا'' منیر نیازی کے ہاں ''موت'' کا استعارہ و پیغام بھی ہے۔ اسی شعر کی مزید وضاحت ڈاکٹر سرور الہدیٰ یوں کرتی ہیں:

> ازل سے کون سی بلا ہے جو سفر میں ہے لیکن اسی ہم سفر کو کسی نے مجسم شکل میں دیکھا نہیں۔ اس کا خوف بہر حال قائم ہے۔ ''کہیں ہو ہی نہ ہو'' کا ٹکڑا خوف کی شدت کو مزید نمایاں اور تیز کرتا ہے۔ شعر کی ردیف ''ہی

نہ ہو'' گمان اور یقین کی کشمکش کو نہایت ہنرمندی اور دردمندی کے ساتھ سامنے لاتی ہے۔''ہوا'' موت کا استعارہ ہوسکتی ہے۔ پہلے مصرعے میں ''بلا'' کا قافیہ ثانی مصرعے کی ''ہوا'' کو فنا پذیری کی علامت بنا دیتا ہے۔ ورنہ تو ہوا زندگی کی علامت بھی ہے۔(۱۱)

منیر نیازی کے ہاں ہوا، شام، خاموشی اور موت بنیادی علامات ہیں۔ وہ مانوس جذبوں کو تاریخی انداز میں پیش کرتے ہیں اُن کی ماضی کے ساتھ گہری دلچسپی، رومانی اندازِ فکر کو نمایاں کرتی ہے۔ وہ پُرانی عمارتوں، پرانی صداؤں اور اُجڑے گھروں کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ بیتے ہوئے لمحات کا سلسلہ حال سے جوڑتے رہتے ہیں۔ جس میں ہوا مرکزی کردار ادا کرتی ہے چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

ہوا جب چلی پھڑ پھڑا کے اڑے
پرندے پرانے محلات کے

(جنگل میں دھنک، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۲۳۳)

آگ جلتی ہے گھروں میں یا کوئی تصویر ہے
یادگار جرم آدم خاکیوں کے سامنے

(ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۴۴۲)

شام ہے گہری، تیز ہوا ہے، سر پہ کھڑی ہے رات
رستہ گئے مسافر کا اب دیا جلا کے دیکھ

(جنگل میں دھنک، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۲۳۶)

صبح سفر کی رات تھی، تارے تھے اور ہوا
سایہ سا ایک دیر تلک بام پر رہا

(ایضاً، ص-۲۵۱)

وہ ہوا تھی شام ہی سے رستے خالی ہو گئے
وہ گھٹا برسی کہ سارا شہر جل تھل ہو گیا

(ایضاً، ص-۲۴۱)

ڈر، خوف و ہراس کا احساس منیر نیازی کی فکر کو مہمیز دیتا ہے۔ صحرا کے حوالے سے ہمیں منیر نیازی کے ہاں پراسرار تصاویر ملتی ہیں اور یہ ڈر اور خوف کی تہوں میں لپٹی ایسی پراسراریت ہے کہ جسے ایک دبے ہوئے ماحول کا سہما قاری پڑھ کر محسوس کرتا ہے کہ یہ تو وہی خیالات تھے جن کو وہ اب تک الفاظ کا پیرہن نہ دے سکا۔ اس کی واضح مثال یوں ہے:

رہتا ہے اک ہراس سا قدموں کے ساتھ ساتھ

چلتا ہے دشت، دشت نوردوں کے ساتھ ساتھ

(ایضاً،ص-۳،۴)

''ہوا'' اور ''موت'' کی علامات کے علاوہ ''شام'' کی علامت بھی منیر نیازی کی شاعری میں کثرت سے استعمال ہوئی ہے اور یہ ''شام'' بھی خوف وزیاں کے احساس کو جنم دیتی ہے۔شام کے ساتھ ساتھ ایک پُراسرار ''جنگل'' کا بھی احساس جڑا ہوا ہے۔یہ ''شام'' اور ''جنگل'' کے استعارے شاعر نے منفی رویوں کی بھرپور عکاسی کے طور پر بھی پیش کئے ہیں۔''شام'' کی علامت کے حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں:''منیر نیازی شام کے حوالے سے بار بار جس منظر کی طرف لوٹتے ہیں وہ ہمارے ذہن میں ایک جغرافیائی حدود کے ساتھ ایک دائرہ ضرور بناتا ہے اور اس شام کے دھندلکے میں ایک خوف زدہ دوڑتا ہوا آدمی اپنے نفسیاتی پس منظر کے ساتھ اپنی تاریخ کے کئے مناظر اُجاگر کرتا چلا جاتا ہے''۔(۱۲)منیر نیازی کی شاعری میں ''شام'' ایک ایسے معاشرے کا مقدر بن جاتی ہے جس میں ''جنگل'' کا قانون ہو۔اس طرح اُن کے ہاں شام اور جنگل دونوں ہی خوف،ڈر،بے امانی کی علامت ہیں۔بقول ڈاکٹر سرور الہدیٰ:

> منیر نیازی کی غزل میں جنگل اور شام کے استعارے خاص طور پر متوجہ کرتے ہیں۔ان کی غزل میں بے امانی اور خوف کے احساس کی مختلف جہات ہیں لیکن جب وہ شام اور جنگل کو بطور استعارہ استعمال کرتے ہیں تو اس کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔جنگل اور شام میں ایک تعلق بھی ہے۔دن کے کسی حصے میں جنگل جایئے شام کا گمان ہوتا ہے جنگل کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں۔نئے شعراء نے وجود کو جنگل سے بھی تشبیہ دی ہے۔جنگل کا بھید اس کی خاموشی میں پوشیدہ ہے لیکن اس خاموش فضا کو جب کوئی آواز توڑتی ہے تو مسافر اس پر کان دھرتا ہے۔(۱۳)

یہ خوف کی انتہائی صورتحال ہی تو ہے کہ جب منیر نیازی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

جنگلوں میں کوئی پیچھے سے بلائے تو منیر
مڑ کے رستے میں کبھی اس کی طرف مت دیکھو

(ماہِ منیر،مشمولہ کلیاتِ منیر،ص-۴۲۵)

یہ خوف کی وہ صورتحال ہے جو تنہائی کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔تنہائی اور پھر جنگل کی سنسناہٹ مِل کر ایسا ماحول بنا دیتے ہیں کہ جس کے بعد خوف کو کسی موضوع یا عنوان کے تحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی بلکہ اِس صورتِ حال کو ذہن میں لاکر ہر انسان کا دل و دماغ جنگل کی سنسناہٹ و خوف کو محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ منیر نیازی کے گردوپیش کا ماحول،اس میں گزرنے والے شب و روز،منیر نیازی کی شخصیت میں بَس کر اُن کی شاعری کا حصہ بنتے چلے گئے۔ منیر نیازی کا شہر،معاشرہ ایسا ہے کہ جس میں ہر شخص کو صنعتی و شہری تہذیب میں عدم تحفظ کا احساس عام ہے اور یہ احساس ہی اُن کی شاعری کی فضا پر چھایا ہوا ہے۔عدم تحفظ کے ساتھ ساتھ نامعلوم کا خوف،گردوپیش کے ماحول میں انسانی سماج کے

ٹھیکیداروں کی پھیلائی ہوئی دہشت، اضطراب، روز وشب کے تھکا دینے والے سلسلوں کی روحانی وجسمانی تھکن، انسانی رویوں کی عطا کردہ تنہائی اور بیگانگی کے گہرے اور مہیب سائے اس انسانی تہذیب کی خصوصیات ہیں۔منیر نیازی نے ان گھناؤنی حقیقتوں کو اپنے جذبوں کی جس سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس میں ڈر، خوف، دہشت، تنہائی وغیرہ ہوا، شام، موت، جنگل اور سفر کی علامتوں میں محسوس کئے جاسکتے ہیں۔بقول امجد طفیل:

> اس کا ایک نہایت طاقتور استعارہ شہر ہے۔شہر منیر نیازی کے ہاں جائے عافیت نہیں بلکہ انسانی وجود کو کچلنے والا خوفناک عفریت ہے۔شاعر کا تخلیقی وجدان اُسے بتاتا ہے کہ انسان نے جس سکون اور عافیت کی تلاش میں شہر آباد کیے تھے وہ تو اُسے میسر نہیں ہے۔جنگل سے نکل کر شہر کی پناہ میں آنے والا انسان اب سکون کی تلاش میں جنگل کی طرف مراجعت کر رہا ہے۔مُجھے منیر نیازی کی شاعری میں شہر اور جنگل کے استعارے ایک دوسرے پر (OverLap) کرتے محسوس ہوتے ہیں۔شاعر کے تخلیقی وجدان نے ان دونوں میں موجود انسانی وجود کے لیے مُضر اثرات کو محسوس کرلیا ہے۔دونوں جگہ انسان کی وجودی تنہائی برقرار ہے۔خوف اور دہشت دونوں جگہ انسان کو گھیرے ہوئے ہے۔(۱۴)

منیر نیازی کی نظم اور غزل کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ باطنی وخارجی اعتبار سے وہ جن حالات وواقعات سے گزرے، خاص طور پر ہجرت اور پھر اُس کے بعد معاشی وسیاسی رویے۔ان کی بنا پر منیر نیازی کے ہاں احتجاجی رویئے کے ساتھ ساتھ، دُکھ، ڈر، خوف اور انھی رویوں کی دین تنہائی کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔فرخندہ اقبال اس حوالے سے کہتی ہیں:

> ہجرت کا بنیادی ثمر خوف اور ڈر جو انسان کے اندر پنجے گاڑھ لیتا ہے، وہ منیر کے کلام میں بھی پھیلا ہوا ہے۔کھو جانے اور چھن جانے کا دُکھ اور درپیش حالات کا خوف جس بے اطمینانی کو جنم دیتا ہے، وہ منیر کے ہاں بھی اُبھرتی ہے۔منیر نہ صرف گذشتہ صحبتوں کے چھن جانے کے دُکھ سے مضمحل ہیں بلکہ موجودہ شہروں اور آبادیوں کی ویرانی سے بھی ڈرے ہوئے ہیں۔(۱۵)

منیر نیازی خوف ودہشت کے طاری رہنے کا الزام بھی ''شہر'' کو ہی دیتے ہیں کہ اصل میں اس کے لوگوں کو ظلم سہنے کی عادت ہوگئی ہے:

وقت ہے دائم ہجرت کا
ایک مسلسل فرقت کا
ظلم ہی آئے راس اُسے
شہر ہے عادی دہشت کا
(ایک مسلسل، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۸۶۲)

ایک جگہ دہشت کے عالم میں گزارے دنوں کو یاد کراتے ہوئے کہتے ہیں:

کر یاد اُن دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں

(دشمنوں کے درمیان شام، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص- ۳۳۴)

منیر نیازی کی شاعری میں جذبات خواہ وہ منفی رویوں کی پیداوار ہوں یا مثبت رویوں کی دین، یوں محسوس ہوتے ہیں کہ جیسے ہمارے سامنے کی باتیں ہیں بقول فرزانہ سید: ''منیر نیازی کی شاعری میں محبت، نفرت، دہشت اور حیرت زندہ اور زندگی بخش ہے''۔(۱۶) ڈر، خوف، دہشت، تھکن اور تنہائی کا رشتہ ماحول کی گھٹن سے بھی ہے اور دوسری طرف شاعر کی اپنی ذات سے بھی۔ شاعر جو بظاہر انجمن آراء لطیفہ باز، ہر وقت بے قرار اور اپنے آس پاس کے شہر سے گفتگو کرنے کا رسیا ہے، اس کے دل میں جو گرہ پڑ گئی ہے، اُسے وہ اپنی شاعری ہی میں کھولتا ہے یا وہ یادوں میں گُم، ماضی میں کھویا ہوا، اپنے سابقہ تجربات کو بار بار یاد کرنے والا دُکھ اور درد، خوف اور دہشت، نا اُمیدی اور نارسائی کا نوحہ خواں ہے۔ اس کے اندر کا طوفاں گرد و پیش کے طوفان کے درمیان ایک پُل کا کام دیتا ہے۔ زمانے کے تضادات اور داخلی تضادات میں اُسے گہری مماثلت ملتی ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق:

> منیر نیازی نے زندگی کی حقیقت کو سب سے زیادہ حس سماعت کی مدد سے جانا ہے۔ وہ صداؤں اور اُن کی غیر موجودگی دونوں سے زبردست شعری تحریک حاصل کرتا ہے۔ اس کے ہاں مختلف آوازوں کا احساس اور ان کی گونج بہت نمایاں ہے۔ وہ ان آوازوں کو کئی معنی پہناتا اور ان سے مختلف النوع پیغامات وصول کرتا نظر آتا ہے۔ اکثر خاموشی اِسے دہشت اور خوف میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مگر کبھی کبھی آوازیں بھی تنہائی اور خوف کی نقیب بن کر سماعت سے ٹکراتی ہیں۔(۱۷)

منیر نیازی کے یہاں، ڈر، خوف اور دہشت کی وجہ صرف ہجرت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فسادات ہی نہیں بلکہ بعد کے معاشرتی حالات زیادہ ذمہ دار ہیں۔ انسانوں کا انسانوں کے ساتھ جانوروں والا سلوک، رنگ و نسل کا تضاد، امیری غریبی کی تقسیم، جاہلانہ اور افسوسناک رسمیں، یہ سب ایک حساس انسان کے دل و دماغ پر خوف اور دہشت طاری کرنے کے لیے بہت ہے۔ اس ضمن میں جلیل عالی کہتے ہیں:

> اکثر نقادوں نے منیر نیازی کے خوف کی بنیادیں فسادات تقسیم کے خونی مناظر میں تلاش کی ہیں۔ مجھے یہ منیر نیازی سے زیادہ اس کے نقادوں کی فکسیشن دکھائی دیتی ہے۔ مرے خیال میں یہ خوف مستقل طور پر ایک ایسے حساس اور شریف النفس فرد کا خوف ہے جسے معاشرے کی بدہیئتی اس کے لطیف احساسات اور بالیدہ شعورِ حُسن و فضیلت کی سطح پر جینے نہیں دیتی۔ نفرت و عناد، فتنہ و فساد، جبر و استحصال، عدم تحفظ اور بے یقینی کے گھنے سائے اسے دہشت زدہ رکھتے ہیں۔ وہ ہر آن خود کو دشمنوں کے درمیاں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے۔(۱۸)

منیر نیازی اردو کے اُن شعراء میں سے ہیں جنھوں نے غزل اور نظم دونوں میں بیک وقت اظہار خیال کیا اور

دونوں کو ابلاغ کا وسیلہ بنایا۔ ڈر، خوف، دہشت، بے حسی، احساسِ محرومی اور ذات کے ریزہ ریزہ ہونے کا ڈر محض نظم میں ہی نہیں غزل میں بھی بھرپور انداز میں پیش کیا۔ ان کا ڈر، خوف صرف جسمانی سطح پر ہی نہیں بلکہ وہ اسے روح کی گہرائیوں میں اُترتا محسوس کرتے ہیں۔ ڈر، خوف اور دہشت کا روح کی گہرائیوں میں بَس جانا اصل میں معاشرے میں بسنے والے انسانوں کی طرف سے عدم تحفظ کا احساس ہے جسے منیر نیازی جیسے حساس شاعر نے محسوس کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں: ''منیر نیازی کے اجتہاد میں اس فضا کا اثر و عمل زیادہ ہے جو رنگ بدلتے موسموں اور مزاج بدلتے انسانوں سے مرتب ہوئی۔ دیدہ حیران سے حیرت کو مٹا دیتی ہے اور خوف اور بے اعتباری کو مجسم کر دیتی ہے''۔ (۱۹) معاشرتی بے حسی کی تصویر کشی منیر نیازی نے بڑے واضح انداز میں کی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بے حس معاشرے نے انسانوں کے گرد ایسی خوف کی فضا قائم کر دی ہے کہ وہ اونچی آواز میں بول کر اپنے اندر کا غبار بھی نہیں نکال سکتے۔

رات میں غربت کے گھر سے
شہر کی جانب چلا
لوگ تھے میرے محلے کے کھڑے
خوف کے لہجے میں باتیں کر رہے

(ایک دُعا جو میں بُھول گیا تھا، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۲۷۷)

منیر نیازی کے خوف سے بھرے لہجے اور خوف کے بھرپور تاثر کے بارے میں ڈاکٹر شہپر رسول کہتے ہیں:

> دراصل خوف کا احساس منیر نیازی کی فکر کو مہمیز کرتا ہے، اور نئی انسانی زندگی کے اس المیے کی تصویر کشی کرتا ہے جو اس کا مقدر بن گیا ہے۔ منیر نیازی کی غزل میں در آنے والے بصری پیکروں میں خوف اور خوف کے احساس کی بنیاد پر تعمیر ہونے والے انکار اور طنز کی کارفرمائی خصوصی طور پر لائق توجہ ہے۔ (۲۰)

دراصل ہمارا عہد، عہد خوف ہے، کچھ علم نہیں کہ کیا ہونے والا ہے، مگر ہر آن خدا کی مخلوق کی طرف سے یہ دھڑکا ضرور ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ یعنی ہمیں خدا سے زیادہ خدا کی مخلوق کا ڈر رہتا ہے۔ منیر نیازی، اپنی نظم ''خدا سے زیادہ خدا کی مخلوق کا ڈر'' میں وہ اس تصور کو یوں اجاگر کرتے ہیں:

ایک بات ہے دل کے اندر
جو باہر نہیں آتی
یاد نہ رکھنا چاہوں اس کو
پر بھولی نہیں جاتی
کافر کہیں نہ سمجھیں مجھ کو، دنیا سے ہوں ڈرتا

اس خوف سے دل کی بات نہیں دنیا سے کرنا

(سیاہ شب کا سمندر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۸۲۷)

ڈر، خوف دراصل تنہائی کی صورت سے جنم لیتے ہیں۔ جب اپنے جیسا کوئی نہ ملے تو اپنے اکلاپے سے خوف محسوس ہونے لگتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے دوسروں سے بھی، پھر آدمی اپنے اندر سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگتا ہے کہ کہیں اپنے آپ کو ہی نہ توڑ دوں۔ خوف در خوف کی کچھ کیفیتیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ''آج کی پاکستانی نظم مجموعی طور پر سہمے ہوئے خارج سے ڈرے ہوئے اور اندر سے ٹوٹے ہوئے انسان کی نظم ہے''(۲۱) منیر نیازی نے نظم کے علاوہ غزل میں بھی اس صورتحال کو بخوبی اجاگر کیا ہے۔

خوف دیتا ہے یہاں ابر میں تنہا ہونا
شہر در بند میں دیواروں کی کثرت دیکھو

(ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۴۲۴)

منیر نیازی کے مطابق انسان کی ذات کا حصہ بننے والا یہ ڈر اور خوف دراصل انہی آدمی نما جانوروں کا خوف ہے، جنہوں نے زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے اور منیر نیازی جیسا نفیس طبع شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

دیکھے ہیں وہ نگر کہ ابھی تک ہوں خوف میں
وہ صورتیں ملی ہیں کہ ڈر جائے آدمی

(چھ رنگین دروازے، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۵۳۲)

منیر نیازی کے باطن میں اس قدر ڈر، خوف اور دہشت کو محسوس کر کے ہر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا لطیفہ بازی اور محفل آرائی پردہ ہے؟ اصل منیر نیازی کون ہے؟ یہ لطیفے باز یا حرماں نصیب، ماضی پرست یا خوف میں مبتلا، تنہائی کی چادر لپیٹے سنسان راہوں کا اکیلا مسافر۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف، منیر نیازی کے خوفزدہ رہنے کے حوالے سے کہتی ہیں:

> دراصل منیر نیازی وقت کے عمل میں حال کو ماضی بنتا دیکھ کر خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے اسے ہر شے کے فنا پذیر ہونے کا شدت سے احساس ہے اور وہ ایک ایک لمحے کی گراں باری کو اپنے دل پر سہتا ہے فنا کا خوف اس شدت سے اس پر حملہ آور ہوتا ہے کہ وہ لمحہ موجود کی دست یاب مسرتوں سے حظ اندوزی سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور ایک مستقل آزردگی کی کیفیت اس کے اشعار میں رچی نظر آتی ہے۔ یہی کیفیت منیر نیازی کی شاعری کی انفرادیت ہے۔ وصل و فراق میں یک ساں نارسائی کا احساس اور ہر سانس سے پیوست اِک احساسِ زیاں اس کے لہجے میں کسک بن کر اُبھرتا ہے۔ منیر نیازی کے ہاں سرور و لذت کے لمحات بھی درد کی راگنی چھیڑ دیتے ہیں۔(۲۲)

منیر نیازی کی شاعری میں ڈر، خوف اور دہشت سے بھرپور اشعار ملتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کے ہاں رجائیہ

اشعار کی تعداد، کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے خاصی نمایاں ہے۔اسی وجہ سے وہ پُر امید نظر آتے ہیں اور خوف، اکتاہٹ ڈر کی اس کیفیت سے ایسی سمت کی طرف سفر کرتے ہیں جو اُن کی شاعری کو منفی رویوں سے تعبیر کرتی ہے۔

جی خوش ہوا ہے گرتے مکانوں کو دیکھ کر
یہ شہر خوفِ خود سے جگر چاک تو ہوا

(ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۴۰۵)

آئے گی پھر بہار اسی شہر میں منیر
تقدیر اس نگر کی فقط خاروخس نہیں

(آغازِ زمستاں میں دوبارہ، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۵۴۲)

روشنی دِکھا دوں گا ان اندھیر نگروں میں
اِک ہوا ضیاؤں کی چار سو چلا دوں گا

(ایضاً، ص-۵۴۳)

خوف اور دہشت کے اتنے گہرے اثرات کو نمایاں کرنے کے باوجود منیر نیازی خوف سے لاچار نہیں ہوتے۔ دراصل یہ وہ سطح ہے کہ جب انسان قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے اُسے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔اس لیے وہ بانگ دہل ہر ابتلاء کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔منیر نیازی نے ایسی ہی صورتِ حال میں لکھا:

ہم ہیں مثال ابر مگر اس ہوا سے ہم
ڈر کر سمٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں

(سفید دن کی ہوا مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۷۹۲)

نئے ماحول کی دین صرف ڈر، خوف یا احساس دہشت بھی نہ تھا بلکہ نچلے طبقے کی مجبوریاں، محرومیوں اور جدید انسان کے احساسِ کم مائیگی، ذہنی انتشار، بغاوت اور ماحول سے بیزاری نے شاعر کو ''تھکن'' کا شکار بھی کر دیا۔ یہ تھکن صرف جسمانی نہیں بلکہ روحانی بھی ہے۔ یہ تھکاوٹ اور کرب نتیجہ ہے اُس طویل مساعی کا جو قیامِ پاکستان کے بعد اِس معاشرے میں اندرونی و بیرونی خطرات سے نمٹنے کے نتیجے میں مقدر بنی۔شہروں میں ڈر، خوف، دہشت، بربریت، بے مروتی اور بے رحمی کے احساسات سے مملو بھیڑیوں ہی کا راج نہیں بلکہ یہاں انسان کو پُر تعفن ماحول کے عفریت کا بھی سامنا ہے جس نے جینے کو ایک سزا بنا رکھا ہے۔اپنے ہی جسموں کو کھانے والے انسان پُر تعفن ماحول میں جینے والے کیڑے مکوڑے تو بن جاتے ہیں، اشرف المخلوقات نہیں کہلا سکتے کیونکہ اشرف المخلوقات بننے کے لئے اچھائی کی ضرورت ہوتی ہے، خدائی صفات کی بیداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر، انسان کی بے حسی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہم لوگ طبعاً تماش بین ہیں اور سیلاب

کی تباہ کاریوں سے لے کر سیاسی تشدد تک ہر نوع کے اچھے بُرے واقعات وحوادث سے بقدرِ ظرف سامانِ تفریح اخذ کرتے رہتے ہیں''۔(۲۳) ہجرت کے بعد پاکستانی معاشرے میں وہم، خوف، گمشدہ اقدار اور روایتوں کی فضا میں سانس لیتا ہوا آدمی جس وقت خارجی دُنیا سے قطعی طور پر ڈر گیا تو پھر اُسے احساس ہوا کہ یہاں قیام کرنا اُس کے لیے کس قدر بُرا ثابت ہوا۔ اور منیر نیازی جیسا شاعر بھی اس سفر میں قیام کو بُرا تصور کرنے لگا۔

تھکن سفر کی بدن شل سا کر گئی ہے منیر
بُرا کیا جو سفر میں قیام کر بیٹھا

(ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۳۹۸)

تھکن کے اس احساس نے انسان کو جستجو اور اپنے آپ کی تلاش سے بھی روکے رکھا جس کی وجہ سے وہ نفسیاتی الجھنوں اور فکری پیچیدگیوں سے دوچار ہونے لگا۔ یوں اُس کے اندر کی کائنات ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹنے پھوٹنے لگی۔

مجھے پہنچنا ہے منزلوں پر لگن ہے اتنی
قدم اٹھانا ہے مجھ کو مشکل تھکن ہے اتنی

(سیاہ شب کا سمندر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۸۲۵)

عمل کی رائیگانی اور طاعت و بغاوت ہر دو کی بے معنویت کا احساس منیر نیازی کے ہاں موجود ہے۔ منیر نیازی اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو انسان کی تھکن کا باعث یہ بھی نظر آتا ہے کہ اُس کی آواز کو دبا دیا گیا ہے اور سچے جذبوں کے اظہار پر قدغن دیکھ کر انھیں اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کا سفر ہجرت کے بعد بھی ختم نہیں ہوا بلکہ یوں لگتا ہے کہ ایک کے بعد ایک دوسرا سفر شروع ہو چکا ہے۔

ابھی مجھے اِک دشت صدا کی ویرانی سے گزرنا ہے
ایک مسافت ختم ہوئی ہے ایک سفر ابھی کرنا ہے

(ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۴۱۰)

ڈاکٹر انعام الحق جاوید اسی ضمن میں کہتے ہیں:

> ایک اور المیہ جو نئے شاعر کا اہم موضوع ہے پابندیوں سے متعلق ہے، انسان کی آزادی رفتہ رفتہ چھنتی جا رہی ہے اور وہ سماج کی گرفت میں پھنستا جا رہا ہے۔ کہیں وہ بولنا چاہتا ہے تو اُس کی آواز دبا دی جاتی ہے اور جہاں کہیں اسے بولنے کا موقع مل جاتا ہے وہاں اُس کی آواز سننے کے باوجود اس کی بات سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔(۲۴)

منیر نیازی سمیت بہت سے شعراء و ادباء کے علاوہ بہت سے مفکرین اور دانشوروں نے انسانی زندگی کے اس المیے کے حوالے سے آواز بلند کی مگر بہت سوں نے لاحاصلی دیکھ کر راستہ بدل لیا اور کچھ نے تھکن سے نڈھال ہو کر کچھ دیر خاموشی

اختیار کرنے میں عافیت سمجھی۔

کہاں تک سوچتے رہتے اسے شامِ غریباں میں
تھکن اتنی سفر کی تھی کہ سونا بھی ضروری تھا

(سفید دن کی ہوا، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۷۹۹)

آج کے انسان کو راستوں کی تھکن کا احساس طویل جدوجہد کے بعد لاحاصلی کی وجہ سے بھی ہے اور روز بروز بے معنی تبدیلی کے باعث بھی، ہر لمحہ تبدیلی، ہر پل تبدیلی، ہر گھڑی تبدیلی، یہی آج کے انسان کی تھکن کی وجہ بھی ہے۔ یہ دُنیا جو بظاہر ترقی کی راہ پر گامزن نظر آتی ہے، اصل میں ایک گہرے بحران میں مبتلا ہے۔ یہ بحران مادی، ذہنی، نفسیاتی اور روحانی ہر طرح سے انسان کے وجود میں سما رہا ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> اس وقت انسان ایک ایسے نظام اقدار اور نظام فکر کی تلاش میں ہے جس سے وہ نہ صرف اس بحران پر قابو پالے بلکہ عدل و انصاف پر مبنی ایک بہتر زندگی بسر کرنے کا خواب پورا کر سکے۔ اسی لئے وہ کائنات، خدا اور انسان کے تعلق سے اپنے سارے بنیادی رشتوں پر نظر ثانی کرنے کے لئے آمادہ ہے لیکن اس خواہش کے باوجود اس کا المیہ یہ ہے کہ ابھی اسے اپنی منزل اور اپنی سمت کا پتہ نہیں ہے۔ ''چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہرو کے ساتھ'' کے عمل نے اسے تھکا دیا ہے۔ (۲۵)

منیر نیازی کے ہاں بھی ایک طویل مساعی اور پھر لاحاصلی ہے۔ جس کے نتیجے میں تھکاوٹ اور کرب کے آثار ملنا فطری ہے۔ اس کے علاوہ کچھ خارجی محرکات بھی ایسے ہیں کہ جن کی بناء پر شاعر کے ہاں غم، کرب اور یاس کی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً فکرِ معاش، نوجوان لڑکیوں کی عمروں کے ڈھلتے سائے اور شادیاں بروقت نہ ہوسکنا، انسان کہ جس کو ایک وقت میں کمال حاصل تھا، اب پستی کے اندھیروں میں گُم ہوتا جا رہا ہے۔

تھکن سے راہ میں چلنا محال بھی ہے مجھے
کمال پر بھی تھا میں ہی، زوال بھی ہے مجھے

(ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۴۴۷)

منیر نیازی اپنے گردوپیش یا تو جھکے لوگوں کو مجبوری میں چلتے دیکھتے ہیں یا پھر زراندوزی کی خاطر بھاگتے، اپنوں کا خون بہانے کے عمل سے اپنی زندگی جہنم بناتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ بقول احمد ہمدانی:

> عہد حاضر میں انسانی رشتوں میں شکست و ریخت کا عمل جاری ہے جس کی وجہ سے صنعتی عہد میں ذرائع پیداوار کے مطابق رشتوں کی تشکیل نو نہ ہونا ہے۔ تمام انسانی رشتے اور قدریں جھوٹی پڑ گئی ہیں کیونکہ ان رشتوں اور قدروں کا تعلق جاگیرداری نظام سے تھا۔ بدلے ہوئے حالات میں ان کا بدلنا بھی ضروری ہے۔ جھوٹے رشتوں اور جھوٹی قدروں کا ردِّ عمل رشتوں اور قدروں سے بیزاری بھی ہوسکتا ہے اور ان کی تشکیل نو بھی۔ (۲۶)

منیر نیازی مختلف مجبوریوں میں جکڑے اور تھکے تھکے قدم اٹھانے والے لوگوں اور خدائے زر پر یقین رکھنے والے بے عمل لوگوں کو سراب کے پیچھے بھاگتے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف ایسے لوگوں کو دیکھ کر اُداس بھی ہوتے ہیں جن کی زندگیاں کسی، پاک اور اونچے مقصد کے لیے قربان ہو جاتی ہیں مگر حاصل، رائیگانی کے دیکھ کر منیر نیازی اُداس ہوتے ہیں۔

تھکے لوگوں کو مجبوری میں چلتے دیکھ لیتا ہوں
میں بَس کی کھڑکیوں سے یہ تماشے دیکھ لیتا ہوں
کبھی دِل میں اُداسی ہو تو اُن میں جانکلتا ہوں
پرانے دوستوں کو چپ سے بیٹھے دیکھ لیتا ہوں

(ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۴۱۱)

بعض اوقات شاعر کو تھکن ہونے کے باوجود تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا

اس کشمکش میں ہم بھی تھکے تو ہیں اے منیر
شہرِ خدا ستم سے مگر پاک تو ہوا

(ایضاً، ص-۴۰۵)

انسانی زندگی میں تھکن اور دُکھ کا باعث فکر اور سوچ کی کمی بھی ہے۔ بھلے ہم جسمانی طور پر بڑے ہو جاتے ہیں لیکن ہماری سوچ بچوں کی سی رہتی ہے، بچپن کی محرومیاں بڑھاپے تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور یہی محرومیاں ہم آنے والی نسلوں کو ورثے میں عطا کرتے ہیں۔

ہماری یہی تھکن، دُکھ، ڈر، خوف، دہشت بالآخر انسانی زندگی میں تنہائی کی صورت میں در آتی ہے۔ احساسِ تنہائی کا پس منظر مذہبی، اخلاقی اور جذباتی اقدار کی شکست وریخت میں تلاش کیا جا سکتا ہے، عہدِ جدید کا حساس انسان جذباتی اور معاشی خلفشار کا شکار ہے۔ انسانوں میں انفرادی واجتماعی آزادی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں نے بھی تنہائی کے احساس میں اضافہ کیا ہے۔ آج کے انسان میں احساس وذہن کی تیزی نے خود اس کے لیے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، یہ انسان معاملہ فہم اور لفظوں اور چہروں کے پیچھے دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا ہے۔ ''خارجی دنیا اور اس کا کاروبار وہ وزنی بات ہے جس سے نفرت کرنے والے اس چکی میں پسنے کے لیے مجبور ہیں اور وہاں حساس انسانوں کو ذلت، حقارت، استحصال، ناانصافی اور اس سے پیدا ہونے والی شدید تنہائی اور خود شکستگی کے علاوہ اور کچھ ملتا نظر نہیں آتا''۔ (۲۷) تنہائی، لاحاصلی، خوف اور زیاں کے احساسات منیر نیازی کی غزل اور نظم دونوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور یوں یہ انسانی زندگی کا مقدر بن جاتے ہیں۔ یہ احساسِ تنہائی ایسا ہے کہ جس میں انسان کا اپنی ذات اور شخصیت سے خائف ہونا ایک تصور کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد گو وہ سارے خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ جن خوابوں کے پھول چنتے ہوئے منیر نیازی درد کی نہ جانے کتنی منازل طے کر آئے تھے لیکن جو کچھ حسرتیں پوری ہوئیں بھی تو اتنی دیر سے کہ نہ تو دل میں ارمان باقی رہے اور نہ

نظروں میں شعور۔ یہ وہ دور تھا جب عدم مساوات، عدم تحفظ کا خوف، تنہائی کی اذیت، قربانیوں کے رائیگاں جانے کا دُکھ، کاروان سے بچھڑ جانے کا دُکھ اور تنہا رہ جانے کا دُکھ ان کی شاعری میں سارے کا سارا رَچ بَس گیا تھا۔ بقول شبہ طراز:

> انیس سو پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں نمایاں ہونے والے شعراء میں ''منیر نیازی'' ایک اہم شناخت کے طور پر رونما ہوتے ہیں، اُن کی شاعری اور شخصیت و مزاج پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جاتا رہے گا۔ نقادوں اور مداحوں نے اُن کو فطرت سے ہم آہنگ شاعر قرار دیا، اُن کی شاعری میں خواب، عفریت، خوف، سانپ اور تنہائی کی شدتوں کو محسوس کیا، اُن کی سادہ بیانی اور بے ساختگی کی داد دی، اُن کے اظہارِ بیان کے اختصار اور جامعیت کو اپنا موضوع بنایا، دھرتی سے جڑے رہنے اور انسانوں کے بیچ میں رہتے ہوئے ذات کی تنہائی کے دُکھ کو احاطہ کیا۔۔۔ بے شک یہ سب باتیں بے حد سچی ہیں۔ ان کی شاعری میں موجود عہد کا کرب اور ان کی اپنی ذات کا دُکھ باہم آمیخت ہوتے ہیں۔ بیان کی بے ساختگی اور سادگی نظم کے حُسن میں حد درجہ اضافہ کرتی ہے اور یہی سادگی اُن کی نظمیں زبان زدِ عام کرنے کا موجب بھی ہوئی ہے۔ (۲۸)

قیامِ پاکستان کے وقت خون ریزی، والد کی وفات، والدہ کی دوسری شادی، سوتیلے بہن بھائیوں کی بے رُخی، پہلی بیوی صغرا کی وفات اور اولاد نہ ہونے کا دُکھ ان سب ذاتی و اجتماعی حوادث نے منیر نیازی کے احساسات و جذبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مگر اسی ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے ایک نیا منیر نیازی اُبھرا۔ منیر نیازی نے اپنی شاعری میں تذبذب کی فضا کا ہر منظر، گرد و پیش کا ہر نظارہ، غرضیکہ زمین و آسمان کی نادیدہ فضاء میں پھیلی ہوئی دشمنی کی بو، تنہائی کی سائیں سائیں اور گرد و پیش کے ماحول کی مکمل عکاسی کرنے کی بھرپور سعی کی۔ اصل میں منیر نیازی غم واندوہ کے دن نہیں بھولتے۔ کوئی اداسی، کسی کا دُکھ، انھیں بھرپور تنہا کر دیتا ہے۔ یہ اُن کے زمانے کے فرد کا مشترکہ احساس تھا۔ اس میں رومانویت کی جھلک بھی ہے اجنبیت اور تنہائی کی عکاسی منیر نیازی کی شاعری کی خاص پہچان ہے۔ بعض اوقات منیر نیازی کے اندر کی تنہائی مجسم باہر آ کھڑی ہوتی ہے اور وہ اپنی ذات کی اہمیت جتاتے رہتے ہیں۔

کھڑا ہوں یوں کسی خالی قطعے کے صحن ویراں میں
کہ جیسے میں زمینوں میں دفینے دیکھ لیتا ہوں

(ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۴۱۱)

ان کی آواز رنج و غم کو جھٹلاتی نہیں بلکہ بڑے شہروں میں رہ کر تنہائی اور افسردگی کے دشت میں گُم ہو جاتی ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ انھیں کائنات کا ذرہ ذرہ، دھوپ، درخت، دریچے، شہر، ویرانے اور سمندر سبھی انسانوں سمیت تنہائی کا شکار نظر آتے ہیں۔ مایوسی و تنہائی نے تو بعض جگہ ان کی شاعری کو جیسے اپنی لپیٹ میں ہی لے لیا ہے اور شہروں میں انسانوں کی اور انسانی زندگی کے ہنگاموں کے باوجود وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔

اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

(تیز ہوا اور تنہا پھول، کلیاتِ منیر، ص-۶۸)

منیر نیازی اندر سے ایک ادھورے اور بکھرے ہوئے انسان تھے جن کے کلام کا نمایاں تاثر تنہائی یا اکلاپے کا درد ملے اور اسی کے زیر اثر دُکھ، کسک اور محرومی کے جذبات پروان چڑھتے نظر آتے ہیں۔ تاہم یہ مایوسی ہمت ہار جانے پر آمادہ نہیں مگر یہ زندگی کو بھی بھرپور لطف اندوز نہیں ہونے دیتی۔ منیر نیازی ایک مکمل صابر و شاکر انسان نہ سہی مگر دوسری طرف وہ زندگی کی تلخیوں کو محسوس کرنے اور انہیں اپنی ذات کا حصہ بنانے کا سلیقہ بخوبی سیکھ گئے تھے۔ اِن کے ہاں تنہائی کی صورت میں جنم لینے والی غم کی لہریں اکثر انہیں اداس کرتی رہیں اور اسی تنہائی کے بطن سے جنم لینے والی مایوسی اداسی میں وہ زندگی کو بھی دیکھتے اور محسوس کرتے رہے۔ یعنی یہ ہوا کہ اُن کے کلام پر دُکھ اور حرماں نصیبی کی بھی گہری چھاپ دکھائی دینے لگی۔ ڈاکٹر شاہین مفتی، منیر نیازی کی تنہائی، خوف اور اُداس ہو جانے کی کیفیت کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> یہ وہ رومانٹک منیر نیازی ہیں جن کے تعشق ذات کے معصومانہ تجربات سے ان کا پہلا مجموعہ کلام بھرا ہوا ہے۔ محبت، حیرت اور خوف کی مِلی جُلی کیفیت نے ان کی ذات کے گرد دائرہ کھینچ رکھا ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ شاعر کے لیے اس کی موجودگی ہی اس کا سب سے بڑا سچ ہے۔ وہ اپنے وجود کی پرتیں کھول کھول کر حیران ہوتا ہے اور اس جھمگٹے میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہوئے اُداس ہو جاتا ہے۔ (۲۹)

عصر حاضر کے گوناگوں انفرادی و اجتماعی آلام و مصائب نے منیر نیازی کی ذات میں احساس تنہائی مزید گہرا کر دیا اور یہی تنہائی اُن کا بالآخر دائمی ساتھی بن گئی اور وہ یہ کہنے لگے:

کتنے یار ہیں پھر بھی منیر اس آبادی میں اکیلا ہے
اپنے ہی غم کے نشے سے اپنا جی بہلاتا ہے

(جنگل میں دھنک، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۲۳۲)

منیر نیازی کو اپنے چھوڑے ہوئے وطن سے بہت محبت تھی۔ اس لیے اُن کے اشعار میں بھی اس والہانہ محبت کا اظہار ملتا ہے اور وہاں کے راستے، گلیاں، لوگ اور وہاں کے مناظر اُن کی یادوں میں محفوظ رہے اور ہجرت کے بعد ملنے والی اجنبیت نے اُن یادوں کو مزید پختہ کر کے ایک نہ ختم ہونے والی تنہائی، دُکھ کی صورت میں اختیار کر لی۔ مہاجرین ایک منزل کے حصول کیلئے گھر سے نکلے مگر بدقسمتی سے نئی مملکت میں ان کی انفرادی پہچان نے انہیں معاشرے سے کاٹ دیا۔ مہاجرین کے ساتھ اس امتیازی سلوک نے اُن میں نہ مندمل ہونے والے احساس تنہائی کو جنم دیا اور منیر نیازی مہاجرین کے دل کی آواز بن کر یوں گویا ہوئے:

زمانے کے لب پہ زمانے کی باتیں

مِری دُکھ بھری داستاں میرے دل میں

(تیز ہوا اور تنہا پھول، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۵۱)

قیام پاکستان نے جو تنہائی منیر نیازی کی شخصیت کا حصہ کر دی وہ بڑی آسانی سے اس تنہائی کا جزو لازم بن کر رہ گئی جو اُن کی روح کے اندر موجود تھی۔ آزادی کے بعد دوسرے شعراء کی طرح منیر نیازی کے سامنے بھی بے شمار مسائل تھے گو کہ سیاسی محکومی کی زنجیریں کٹ چکی تھیں لیکن ذہنی پس ماندگی کے پھندے ابھی موجود تھے۔ اِن تمام مسائل نے مِل کر جدید شعراء کی زندگی میں تنہائی کا زہر گھول دیا۔ عقیل احمد صدیقی اس ضمن میں کہتے ہیں:

> نئے شاعروں کی تنہائی جدید زندگی کا جبر ہے۔ یہ تنہائی اپنی ذات اور کائنات کے شعور کے بعد کی منزل ہے۔ انسان نے ماورائی خدا سے اپنا دامن چھڑا لیا اور خدا کے مقابلے میں مشین پیدا کی لیکن وہ خود اپنی تخلیق کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔ مشین پر اس کا اختیار نہیں گویا زندگی کی رفتار پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں۔ یہ احساسِ بے چارگی اور پھر یہ احساس بھی کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں ''بے چہرہ'' ہے، تنہائی کے فطری اسباب ہیں لیکن یہ تنہائی صرف فنکار تک محدود نہیں بلکہ آج کے ہر فرد کا مقدر ہے اگر وہ حساس واقع ہوا ہے۔ (۳۰)

قیام پاکستان کے بعد شعراء نے اعصابی دباؤ، ذہنی اذیتوں کے بیان کے ساتھ ساتھ نفسیاتی پیچیدگیوں سے معمور دِل کی کہانی کو بھرپور انداز میں بیان کیا۔ دل کی ویرانی جب بہت بڑھی تو رفیق و ہمدم کی تلاش آدرش بن گئی۔ اس طرح ذات کی تنہائی، خوف، فکری کرب پاکستانی شاعری کا حصہ نظر آنے لگا۔ ناصر کاظمی شعراء کے ہاں ازلی تنہائی کے موضوع کے حوالے سے کہتے ہیں:

> دنیا کی ہر شے تنہائی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اس عالم کی تمام مخلوقات تنہائی کے پردوں ہی میں نشو ونما پاتی ہیں۔ انسان شعور رکھتا ہے۔ اس لیے وہ تمام مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ حساس ہے۔۔۔ شاعر کی تنہائیوں نے اس دُنیا کے گوشے گوشے کو ایک حیات تازہ بخشی ہے اور اس کی تنہائی کا یہ سفر ابد تک جاری رہے گا۔ (۳۱)

تنہائی کا موضوع اُردو شاعری میں نیا نہیں۔ یہ امیر خسرو کے دور سے لے کر آج کے اِس مشینی دور میں زیادہ پنپ گیا ہے۔ تنہائی کا یہ احساس کہیں کہیں شعراء کے ہاں فرار کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے اور شاعر خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے۔ یہی احساسِ تنہائی ہے جو شاعر کو مجمع میں اکیلا رکھتا ہے۔ منیر نیازی کی شاعری میں پھیلتے ہوئے شہروں کی اجاڑ، سنسان راہوں، بکھرتے ہوئے قدری رویوں، بدہیئت معاشرے کی کامیابیوں، شہر کے بے معنی ہنگاموں اور بکھرتے ٹوٹتے انسانی رابطوں میں بے رُخی کی جگہ اعتبار کی تلاش ہے۔ منیر نیازی کے ہاں جہاں زر پرست معاشرے سے بیزاری اور ناگواری کا اظہار ملتا ہے وہیں کڑی دھوپ کے اس سفر میں اداسی، تنہائی اور اجنبیت کا بھی بھرپور اظہار ملتا ہے۔ سلیم یزدانی کے مطابق:

> وہ ہر وقت ایک وجدانی اور اضطراری کیفیت میں نظر آتا تھا۔ اس کی کچھ کچھ وجہ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ منیر نیازی اپنے اندر اور باہر مسافر تھا اس نے روداد سفر کو سطح کمال تک پہنچا دیا تھا اور یہ سبق دیا کہ زندگی کبھی ختم نہ ہونے والی نعمت ہے ازل سے ابد تک۔ منیر نیازی اپنی ذات کے جوہر سے آشنا ہو چکا تھا ہونے نہ ہونے

کے راز کو اس نے پا لیا تھا۔ اس نے تنہائی کے خوفناک دشت کو عبور کر لیا تھا اور نئے سفر کی تیاری کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ جہاں غموں سے رہائی کی نوید سنائی دینے والی تھی۔ آزادی کا مژدہ سنایا جانے والا تھا۔ (۳۲)

منیر نیازی کے ہاں کسی قسم کا تکلف یا بناوٹ نہیں بلکہ انہوں نے اپنی تنہائیوں، اداسیوں، محرومیوں اور دل کے چرکوں اور قلبی وارداتوں تک کو سیدھے سادے انداز میں پیش کر دیا اور تنہائیوں کے احساس کے ساتھ جینے کا یہ انداز تمام تخلیق کاروں کا ورثہ بھی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان کے مطابق: ''زبردستی کے پیچھے بھاگنے والے معاشرے میں اُداسی اور تنہائی معاشرے کے گھناؤنے ماحول سے پناہ دیتے ہیں۔۔۔۔ یہ اُداسی کوئی ذاتی نہیں بلکہ تخلیقی لوگوں کی مشترکہ تقدیر ہے''۔ (۳۳)

منیر نیازی نے اپنی شاعری میں تنہائی کو بیان کرنے کے لیے مختلف مضمون باندھے ہیں۔ وہ طرح طرح کے استعارے استعمال کر کے اپنے دِل کی حالت اور چاروں طرف بکھری ہوئی تنہائی کا ذکر کرتے رہے۔ منیر نیازی کی اس تنہائی میں بے بسی بھی نظر آتی ہے اور سوال بھی کہ وہ اتنی بڑی دُنیا میں اکیلے کیوں ہے؟ ان کا کوئی ہمدرد ساتھی نہیں جو انھیں دُنیا والوں کی دی ہوئی تنہائیوں سے نکالے۔ منیر نیازی کے ہاں مکاں تالا مکاں ایک جلنے بجھنے اور سلگنے والی کربناک تنہائی ہے۔ اجنبیت کا ایک شدید احساس ہے۔ شاعر اس لامتناہی کائنات کی بے کراں وسعتوں میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے اور فطرت سے اور معاشرے سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر پاتا۔ وہ بیرونی عناصر اور محرکات سے غیر مطمئن ہے اور اس عدم اطمینان کے باعث ایک مسلسل کرب اس کی روح میں جاگتا رہتا ہے۔ تنہائی کا جو احساس منیر نیازی کے ہاں ہے وہ ٹھوس معروضی حقیقتوں کی پیداوار ہے۔ ٹھوس معروضی حقیقتوں سے پیدا ہونے والی تنہائی کا حوالہ ہمارے جدید دور کی دین ہے جو شہروں کی تہذیبی زندگی کو متعین کرنے والے سماجی نظام نے پیدا کیا ہے۔

منیر نیازی نے انسان کی ازلی وابدی تنہائی کے نوحے بھی رقم کئے ہیں اور ذات شناسی کے بحرِ پایاب کی وسعت کو بھی عبور کیا ہے۔ ان کی غزل میں ایک تمدن کی گونج، ایک تہذیب کی چیخ اور ایک ثقافت کا آشوب درج ہے۔

''تنہائی'' کا موضوع معاشرے میں عارضی احساس کے طور پر پنپ ضرور رہا ہے مگر یہ تقریباً ہر شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی دخیل ضرور ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاید ہی کوئی شاعر ایسا ملے گا جس نے ''تنہائی'' جیسے احساس کو اپنی شاعری میں نہ سمویا ہو۔ ضروری نہیں کہ ''تنہائی'' ہر شاعر کا ذاتی تجربہ رہی ہو، علم اور مشاہدے کی مدد سے دوسروں کے تجربے بھی اس کے کام آتے ہیں۔ اس طرح تنہائی کم وبیش ہر شخص کی زندگی کے بڑے حصے کو سماجی بنا دیتی ہے۔ منیر نیازی کی ذات میں تنہائی کا احساس بچپن میں والد کی وفات کے ساتھ ہی نظر آتا ہے۔ بچپن کی یہی تنہائی پھر بڑھاپے میں بھی جوان رہی اور کسی ناگن کی طرح پھنکارتی بھی رہی۔ یہ صورتِ حال منیر نیازی کے ہاں اُن کی مختصر نظم ''والد مرحوم کی یاد میں'' میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے:

کل میں تنہائی سے ڈر کر
اُس کو ڈھونڈنے نکلا

(ساعتِ سیار مشمولہ کلیاتِ منیر،ص-۵۹۱)

بقول ڈاکٹر شاہین مفتی: ''منیر کی اس تنہائی کی کچھ جڑیں بچپن میں یتیم ہو جانے اور ازاں بعد ہوشیار پور سے مہاجرت کے سانحے سے جڑی ہیں''۔(۳۴) معاشرے میں بالادست طبقہ اپنے مفادات کیلئے کمزور طبقے کو ہمیشہ زیرِ عتاب رکھتا ہے۔ اِس طبقاتی کشمکش کی جڑیں معاشی نظام کی گہرائی تک پیوست ہو جاتی ہیں۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ منیر نیازی کے عہد میں یہ اُمید پیدا ہوئی تھی کہ اس نامنصفانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ قیام پاکستان کے اولین دور میں یہ اُمید پوری ہوتی نظر آ رہی تھی لیکن ایک مرتبہ پھر بالادست طبقے کے لوگوں نے شب خون مار کر غریب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس ماحول میں حساس لوگ داخلیت پسند ہو کر تنہائی کا شکار ہوئے۔ اُن کی امیدیں ہی نہیں ٹوٹیں بلکہ اُن کی اعلیٰ صلاحیتوں کی ناقدری بھی کی گئی۔ ایسے میں تنہائی انہیں پناہ فراہم کرتی۔ ایسی صورت میں منیر نیازی سب کی آواز کی یوں ترجمانی کرتے ہیں:

ناشناسی دہر کی تنہا ہمیں کرتی گئی
ہوتے ہوتے ہم زمانے سے جُدا ہوتے گئے

(آغازِ زمستاں میں دوبارہ، مشمولہ کلیاتِ منیر،ص-۵۴۸)

منیر نیازی اپنی تنہائی کے درد کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تن تنہا میں کشتی میں تھا
دل میں وہم خدائی کے
سو سو فکروں کے سائے تھے
سو سو رنگ جدائی کے

(ساعتِ سیار، مشمولہ کلیاتِ منیر،ص-۶۳۹)

مجید امجد منیر نیازی کی تنہائی اور زندگی کے دکھوں کے متعلق کہتے ہیں:

> منیر نیازی کے پاس کیا تھا؟ کوئی سایہ دیوار بھی نہ تھا۔ صرف شعر کہنے کی دھن۔ یوں اپنے آپ میں تنہا اس نے اپنی زندگی کی ایک ایک تڑپ، اپنے تجربات کی ایک ایک کسک ہوا کے جھونکوں کی سلوٹوں سے تراشی ہوئی سطور کے اندر رکھ دی۔(۳۵)

معاشرے میں موجود یہی فرد اور سماج کی آویزش تھی کہ جس نے افراد کے مدافعتی نظام میں توڑ پھوڑ کی اور فرد بھرے میلے میں مادرزاد برہنہ ہوتا گیا۔ اس درد کو منیر نیازی کی نظم ''سپنا آگے جاتا کیسے'' میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

راز جو حد سے باہر میں تھا
اپنا آپ دکھاتا کیسے

سپنے کی بھی حد تھی آخر
سپنا آگے جاتا کیسے

(پہلی بات ہی آخری تھی، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۶۶۰)

منیر نیازی ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے اپنے خیالات کی روانی میں فرق تو نہ آنے دیا مگر قلم کی روانی میں آخری عمر میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہ زمانے کی تلخ حقیقتوں کو جان چکے تھے اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ حالات جلد بدلنے والے نہیں۔ مسلسل سفر جو کہ سیاسی بھی تھا اور سماجی و معاشی بھی، نے انھیں اکلاپے کا احساس شدت سے دلانا شروع کر دیا تھا وہ کہتے ہیں:

میں اکیلا اور سفر کی شام رنگوں میں ڈھلی
پھر یہ منظر میری نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا

(جنگل میں دھنک، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۲۴۱)

اس دورِ قہر سامان میں جب کہ ہر طرف نفسا نفسی اور چھینا جھپٹی کا عالم ہے تو ایسے میں تنہائی، اجنبیت، یادِ ماضی، اپنوں سے بددلی اور ہجرت و نارسائی کے عذاب کا شدت سے احساس ہونا فطری سی بات ہے۔ اس تنہائی کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے منیر نیازی کہتے ہیں:

لاکھوں شکلوں کے میلے میں تنہا رہنا میرا کام
بھیس بدل کر دیکھتے رہنا تیز ہواؤں کا کہرام
ایک طرف آواز کا سورج، ایک طرف اِک گونگی شام
ایک طرف جسموں کی خوشبو، ایک طرف اس کا انجام
بن گیا قاتل میرے لیے تو اپنی ہی نظروں کا دام
سب سے بڑا ہے نام خدا کا اُس کے بعد ہے میرا نام

(جنگل میں دھنک، مشمولہ کلیاتِ منیر، ص-۲۱۸)

منیر نیازی کی غزلوں میں تنہائی کے احساس کو ڈاکٹر وقار احمد رضوی یوں بیان کرتے ہیں:

انسان اکیلا اور تنہا فرد ہے جو اپنی لامحدود ذمہ داریوں میں گھرا ہوا ہے اس زمین پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بغیر کسی مدد اور سہارے کے۔ ہر آدمی کی معنویت دوسرے آدمی کی معنویت سے مختلف ہوتی ہے۔ انسان اپنے حقائق کی آگاہی حاصل کر کے خود فریبی سے بچ سکتا ہے۔ یہ وہ موضوعات ہیں جو منیر نے اپنی غزلوں میں موضوعِ سخن بنائے ہیں۔ (۳۶)

۱۹۶۰ء کے بعد غزل اور نظم دونوں میں ہی ایک عجب سی اُداسی، سوگواری، مایوسی اور تنہائی کی مسلسل تکرار نظر آتی

ہے۔جس میں زندگی کے تئیں کسی مثبت رویے کی اُمید شاد و نادر ہی کی جاسکتی ہے۔اس احساس تنہائی کی وجوہات سیاسی،ثقافتی، معاشرتی اور معاشی ابتری میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ پاکستان کے قیام میں مذہبی عنصر نے کلیدی کردار ادا کیا مگر قیامِ پاکستان کے فقط دس سال بعد ہی مذہبی فرقہ واریت نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔اقبالؒ کا مردِ مومن اب گلِ لالہ کی صورت بے رحمی کے صحرا میں تنہا رہ گیا۔تنہائی کا تصور منیر نیازی کے یہاں بڑا خوفناک ہے اور انھیں انسانوں سمیت ہر شے تنہائی کی چادر اوڑھے نظر آتی ہے

یہ بے صدا سنگ، در اکیلے
اجاڑ سنسان گھر اکیلے

(دشمنوں کے درمیان شام،مشمولہ کلیاتِ منیر،ص -۳۱۶)

رات اک اجڑے مکاں پر جا کے جب آواز دی
گونج اٹھے بام و در میری صدا کے سامنے

(جنگل میں دھنک،مشمولہ کلیاتِ منیر،ص- ۲۴۴)

روزمرہ کی زندگی کے تجربے منیر نیازی کی شاعری میں ایسے جذبے پیدا کرتے ہیں کہ قاری کو وہ تجربے آپ بیتی محسوس ہوتے ہیں۔تقسیمِ وطن،ہجرت کا کرب،فسادات،اپنی جڑوں سے کٹنے کا غم،اُن سے پیدا ہونے والے انسانی مسائل اور مختلف ذہنی کیفیات،ایسا تجربہ ہے کہ جس نے منیر نیازی کو گہرے طور پر متاثر کیا۔یہی نہیں بلکہ معاشرے میں بے اطمینانی، بے یقینی،اور عدم توازن کے آثار،ہر شعبہ حیات میں نمودار ہونے لگے،گھر کی یاد،دربدری کا عذاب،عدم تحفظ کا خوف،تنہائی کی اذیت،قربانیوں کے رائیگاں جانے کا دُکھ،معاشرے کے غالب رجحانات اور تجربات بن کر سامنے آگئے اور ان کو منیر نیازی سمیت اردو شعراء نے مختلف استعارات اور کنایوں میں بیان کیا۔منیر نیازی ہمیشہ معاشرے سے عدم مطابقت کا شکار رہے اور اسی بنا پر خود کو تنہا بھی سمجھتے رہے۔یہی تنہائی کا غم اُن کی شاعری کی اساس بن گیا اور مرتے دم تک وہ اس احساس غم سے چھٹکارا نہ پا سکے۔منیر نیازی ایک ایسا شخص تھا،جس نے ہزاروں خاندانوں کو اپنی نظروں کے سامنے وطن عزیز کے لیے قربان ہوتے اور پھر لٹے پٹے قافلوں کی آنکھوں میں خوابوں کو دھول بنتے بھی دیکھا۔تو پھر ایسا شخص ان مناظر کو کیونکر بھول سکتا تھا جو اُس کی آنکھوں کی پتلیوں میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔اس تلخی میں اُس وقت مزید اضافہ ہوا جب اپنے ہی لوگ جذبہ ہمدردی سے عاری اور دھوکا دہی میں ملوث ہو گئے۔اپنے ایک انٹرویو میں منیر نیازی کہتے ہیں:

> شہروں پر تو الزام ہے،ان میں بسنے والے لوگوں کے دھوکے اور عیاریاں سب ایک جیسی ہیں۔کراچی میں بچوں کو ٹی ٹی چلانا سکھا دیا ہے۔جعل سازی کا ہر نیا طریقہ ان لوگوں نے اپنا لیا ہے۔میں کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ہم کس سے ملیں،پورے شہر میں کتنے لوگ ایسے ہیں،جن سے مکالمہ کیا جا سکے،جو میری بات سُن سکیں،اسے سمجھ کر جواب دے سکیں،نہ ہونے کے مترادف ہیں،اس لیے میں کسی سے نہیں ملتا۔(۳۷)

منیر نیازی کی تنہائی، ڈر، خوف اور دہشت کی ایک وجہ انسانی رویے بھی ہیں۔ اپنی تنہایوں کے لیے وہ انسانی معاشرے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اس ضمن میں قاضی جاوید کہتے ہیں:

> ان ناشائستہ غیر مہذب اور بے نیاز لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے میں کہاں تک پرواز کر سکتا ہوں۔ حالات نے میرا مقدران کے ساتھ نتھی کر دیا ہے۔ میری اوران کی ذہنی سطح ایک سی ہے اور نہ ہی جذباتی سطح۔ میں ان کے ساتھ کمیونی کیٹ نہیں کر سکتا۔ نہ میں ان تک پہنچ پاتا ہوں اور نہ ہی وہ مجھ تک پہنچ پاتے ہیں۔ اس لیے مجھے تنہائی۔۔۔۔ بے کراں تنہائی۔۔۔۔ میں جینا پڑا ہے۔ اُداسی، ویرانی اور ضائع ہو جانے کا احساس ایک پل کے لیے بھی جی سے نہیں جاتا۔ (۳۸)

منیر نیازی ایک اعلیٰ تخلیق کار کی طرح اپنی تنہائی سے بھی شاہکار بناتے رہے۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی کے خیال میں: ''وہ ایک سنگ تراش کی طرح غزل میں ہیروں کی طرح صنم تراشتے ہیں۔ اس میں زندگی کی اَن گنت خواہشیں اور حسرت کی لاشیں ہیں۔ ان کی آواز درد کو جھٹلاتی نہیں بلکہ بڑے شہروں میں رہ کر تنہائی او ر افسردگی کی وحشت میں گم ہو جاتی ہے''۔ (۳۹) دیکھا جائے تو تخلیق کار ہمیشہ تنہائیوں میں ہوتا ہے کیونکہ اُس کا ذہن تنہائی میں سُچے موتی پروتا ہے اور کچھ تقدیر اُس سے بڑا کام کروانے کیلئے اُسے ایسے ہی مواقع فراہم کرتی ہے جس سے وہ اپنے دماغ کی کھیتی کو مزید زرخیز بنا سکے۔ احمد ندیم قاسمی کے مطابق: ''منیر نیازی تنہائی کا شاعر ہے۔ ہر اچھا فنکار تنہا ہی رہتا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کی صورت حال پر قناعت نہیں کر سکتا۔ اس لیے تنہا ہے وہ اس بدصورت دنیا میں خوبصورتیوں کا متلاشی ہے اس لئے تنہا ہے''۔ (۴۰) منیر نیازی کے احساسِ تنہائی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر نجیبہ عارف کہتی ہیں: ''منیر نیازی کی تنہائی محض فرد کی تنہائی نہیں۔ یہ ایک عہد کی تنہائی ہے جو ایک بڑے تہذیبی خلا کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے اور شعور و آگاہی کی قیمت بھی''۔ (۴۱)

حوالہ جات

۱۔ حامد بیگ، مرزا، مضمون: شاعرانہ خیال کی منطق مشمولہ ماہِ نو، ماہنامہ، لاہور، جلد: ۳۰، شمارہ: ۷، جولائی ۱۹۸۴ء، ص-۲۱

۲۔ ابوالکلام قاسمی، شاعری کی تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۱ء، ص-۲۶۸

۳۔ شہپر رسول، ڈاکٹر، مضمون: منیر نیازی مشمولہ اردو غزل میں پیکر تراشی، نئی دہلی، حرا پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص-۳۵۴

۴۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، پاکستانی اُردو غزل مشمولہ اُرد و غزل، مرتبہ: کامل قریشی، ڈاکٹر، اُردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص-۲۹۷، ۲۹۸

۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی بحوالہ عقیل احمد صدیقی، جدید اُردو نظم- نظریہ و عمل، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص-۱۲۶

۶۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، طرفیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص-۸۱

۷۔ نظیر صدیقی، جدید اردو غزل ایک مطالعہ، گلوب پبلشرز اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص-۱۱۹

۸۔ انتظار حسین، دیباچہ ماہِ منیر، مشمولہ کلیاتِ منیر، ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص-۳۵۳

۹۔ امجد طفیل، مضمون: منیر نیازی کی شعری کائنات مشمولہ ادبیات سہ ماہی، بیادِ منیر نیازی، اسلام آباد، شمارہ: ۸۴،۸۳، اپریل تا ستمبر ۲۰۰۹ء، ص-۲۲۶

۱۰۔ شہپر رسول، ڈاکٹر، مضمون: منیر نیازی مشمولہ اردو غزل میں پیکر تراشی، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص-۳۵۵

۱۱۔ سرور الہدیٰ، ڈاکٹر، منیر نیازی کی غزل مشمولہ روشنائی، کراچی، شمارہ ۲۹، ۲۸، جنوری، جون ۲۰۰۷ء، ص-۲۰۱، ۲۰۰

۱۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستان کی نئی نظم پر ایک گفتگو مشمولہ اوراق ماہنامہ، لاہور، جدید نظم نمبر، شمارہ: ۸، ۷، جلد: ۲، ۱ جولائی، اگست، ۱۹۷۷ء، ص-۴۵۹

۱۳۔ سرور الہدیٰ، ڈاکٹر، منیر نیازی کی غزل مشمولہ روشنائی، کراچی، شمارہ: ۲۹، ۲۸ جنوری، جون، ۲۰۰۷ء، ص-۲۰۴

۱۴۔ امجد طفیل، مضمون: منیر نیازی کی شعری کائنات مشمولہ سہ ماہی، بیادِ منیر نیازی، ادبیات، ص-۲۳۲

۱۵۔ فرخندہ اقبال، مضمون: بیسویں صدی کا منفرد شاعر مشمولہ راوی، لاہور، جلد: ۹۴، شمارہ ۰۱، ۲۰۰۷ء، ص-۱۲۹

۱۶۔ فرزانہ سید، مضمون: منیر نیازی مشمولہ نقوشِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص-۴۷۵

۱۷۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، مضمون: منیر نیازی کی طلسمی کائناتِ شعر مشمولہ سمبل، سہ ماہی، راولپنڈی، شمارہ جنوری، جون ۲۰۰۷ء، ص-۳۵

۱۸۔ جلیل عالی، مضمون: منیر نیازی ایک پورا شاعر مشمولہ سمبل، سہ ماہی، راولپنڈی، شمارہ، جنوری، جون ۲۰۰۷ء، ص-۲۷

۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص-۴۹۵

۲۰۔ شہپر رسول، ڈاکٹر، مضمون: منیر نیازی مشمولہ اُردو غزل میں پیکر تراشی (آزادی کے بعد)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص-۳۵۶، ۳۵۷

۲۱۔ غفور شاہ قاسم، پروفیسر، پاکستان میں نظم نگاری مشمولہ پاکستانی ادب ۱۹۴۷ سے تا حال، بک ٹاک، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص-۴۵

۲۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، مضمون: منیر نیازی کی طلسمی کائنات شعر مشمولہ سمبل، ص-۳۵

۲۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص-۳۳۱

۲۴۔ انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، مضمون: پنجابی غزل، آزادی کے بعد مشمولہ ادبیات، سہ ماہی، اسلام آباد، شمارہ: ۲۵، جلد: ۶، سرما ۱۹۹۳ء، ص-۵۹

۲۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، مرتبہ: خاور جمیل، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص-۲۷۳

۲۶۔ احمد ہمدانی، باتیں نئے شاعروں کی مشمولہ قصہ نئی شاعری کا، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص-۹۶

۲۷۔ بشیر بدر، ڈاکٹر، آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص-۳۱۹

۲۸۔ شِبہ طراز، مضمون: نظم اور عنوان کا باہمی ربط مشمولہ ادبیات، سہ ماہی، بیادِ منیر نیازی اسلام آباد، شمارہ: ۸۴،۸۳، اپریل تا ستمبر، ۲۰۰۹ء، ص-۲۵۵

۲۹۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، منیر نیازی کا ''میں''، مشمولہ جدید اُردو نظم میں وجودیت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص-۲۹۱

۳۰۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اُردو نظم- نظریہ و عمل، ص-۳۷۳

۳۱۔ ناصر کاظمی، دیباچہ: پہلی بارش، فضل حق اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص-۳۳

۳۲۔ سلیم یزدانی، روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۲ جنوری ۲۰۰۷ء،

۳۳۔ سہیل احمد خاں، سرسوں کے پھول کا ہم عصر مشمولہ ہجر کی رات کا ستارا، مرتبہ: احمد مشتاق، ضیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۳ء ص-۱۸۶

۳۴۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، منیر نیازی کا ''میں''، مشمولہ جدید اردو نظم میں وجودیت، ص-۲۹۸

۳۵۔ مجید امجد، دیباچہ مشمولہ جنگل میں دھنک، کلیاتِ منیر، ماورا، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص-۱۵۰

۳۶۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ جدید اُردو غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص-۹۱۲، ۹۱۳

۳۷۔ امرینہ خان، منیر نیازی: ایک گفتگو مشمولہ راوی، لاہور، جلد: ۹۴، شمارہ: ۱، ۲۰۰۷ء، ص-۱۲۰

۳۸۔ قاضی جاوید، اک شمع انوکھی بجھ گئی ہے مشمولہ ادبیات سہ ماہی، بیادِ منیر نیازی، ص-۱۵۹

۳۹۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ جدید اردو غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء، ص-۹۱۲

۴۰۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ: چھ رنگیں دروازے مشمولہ کلیاتِ منیر، ماورا، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص-۴۶۶

۴۱۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، مضمون: منیر نیازی کی طلسمی کائناتِ شعر، ص-۳۶